جناب بشیر احمد ڈار

اقبال کا نصب العینی معاشرہ

اور

اقتصادی مسائل

مئی ۱۹۳۷ میں علامہ اقبال نے قائداعظم کے نام ایک خط میں اقتصادی مسئلے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھا تھا۔

"مسلمانوں میں غربت کا رفع کرنا کس طرح ممکن ہے، اس مسئلے کے حل پر مسلم لیگ کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ خوش قسمتی سے اس کا حل اسلامی قوانین کے نافذ کرنے میں مضمر ہے، لیکن اس قانون میں جدید تصورات کی روشنی میں مناسب تبدیلی کرنی ہوگی اسلامی قانون کے طویل مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظامِ قانون کو صحیح طور پر سمجھا جائے اور پھر اس پر عمل کیا جائے تو اس سے ہر انسان کی کم از کم بنیادی ضروریات کا صحیح انتظام ہو سکتا ہے۔ لیکن اسلامی شریعت کا ارتقا اور اس کا نفاذ موجودہ حالات میں ممکن نہیں جب تک یہاں ایک یا ایک سے زیادہ مسلم مملکتیں قائم نہ ہو جائیں۔"

اسلام میں اقتصادی مسائل کے حل کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور کے حالات کا مختصر خاکہ سامنے ہو۔ اسلامی دور میں عربی معاشرے میں جاگیرداری کا کوئی تصور نہ تھا لیکن چونکہ ان لوگوں کی اقتصادی زندگی کا دارومدار تجارت پر تھا اس لیے ان میں وہ تمام نقائص پیدا ہو چکے تھے جو سرمایہ دارانہ نظام کی خصوصیات ہیں۔ مثلاً ربا کا رواج جس کے متعلق قرآنِ حکیم میں سخت ترین وعید آئی ہے۔ اور اسی کے ساتھ کہا گیا ہے "صدقات سے مال میں برکت آتی ہے۔ اور ربا سے تنگ دستی اور بدحالی"۔ یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ برکت اور تنگ دستی کا یہ نظریہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ یعنی ربا سے ساری قوم اور سارا معاشرہ بہ حیثیتِ مجموعی تنگ دست اور پریشان حال ہو جاتا ہے اور اگر صدقات کا منظم طریقہ کار اختیار کیا جائے، یعنی دولت مند اپنا مال حاجت مندوں

پر خرچ کریں تو معاشرے میں خوشحالی پیدا ہوتی ہے۔ (سورہ بقرہ ۲۷۶، ۲) دوسری شے جس کی طرف قرآن مجید نے لوگوں کی توجہ منعطف کرائی ہے، وہ مال و دولت کی محبت ہے یہ ایک فطری تقاضا ہے۔ اولاد کی محبت کی طرح مال سے محبت فی نفسہ کوئی برائی نہیں۔ لیکن برائی اس وقت ہوتی ہے جب یہ اپنے جائز حدود سے تجاوز کر جائے۔ اولاد اور دولت کی محبت جب انسان کو اپنی ذمہ داریوں سے غافل اور معاشرے کی ضروریات سے بے پرواہ کر دے تو یقیناً اس وقت غور کرنے کی ضرورت ہو گی کیونکہ اگر معاشرہ کسی بحران میں مبتلا ہو گا تو یہی اولاد اور دولت اس وقت بے کار ہو جائیں گے۔

؏ مردن بے مرگ و بے گور و کفن گم شدن در نقرہ و فرزند و زن

چنانچہ سورہ آل عمران میں خدا فرماتا ہے کہ:

"لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت (فطری طور پر) ہوتی ہے مثلاً عورتیں، اولاد، جمع کی ہوئی دولت، گھوڑے، مویشی، یہ سب اس دنیا کی متاع ہیں۔ لیکن انجام کار کی خوبی تو اللہ کے پاس ہی ہے۔ (یہ چیز ان لوگوں کے لیے ہے) جو صبر کرنے والے، راست باز، فروتنی کرنے والے اور مال خرچ کرنے والے اور آخر شب میں گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں۔" (۱۷-۱۴-۳)

مکی زندگی میں جو آیات نازل ہوئیں ان میں حُبِّ زر کی زیادتی سے منع کیا گیا۔ اور نیکی کا انحصار اچھے مقصد کے لیے دولت کا خرچ کرنا قرار دیا گیا ہے۔

"تم لوگ یتیم کی قدر نہیں کرتے اور دوسروں کو مساکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب بھی نہیں دیتے۔ میراث کا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے بہت ہی محبت رکھتے ہو" (۸۹، ۱۷-۲۰)

"مشکل راستہ کیا ہے! کسی کی گردن کو غلامی سے چھڑانا، فاقہ کے دن کھانا کھلانا کسی رشتہ دار یتیم یا کسی خاک نشین محتاج کی مدد کرنا" (۹۰، ۱۲-۱۶)

"افسوس ہے اس شخص پر جو مال جمع کرتا ہے اور اس کو بار بار گنتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس سدا رہے گا" (۱۰۴، ۲-۳)

"کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو دین کو جھٹلاتا ہے یہ وہ شخص ہے جو یتیم سے بدسلوکی کرتا ہے اور مساکین کو کھانا کھلانے کی دوسروں کو ترغیب نہیں دیتا"

یہ اور بے شمار آیتیں قرآن حکیم کے مختلف مقامات پر موجود ہیں جن میں اقتصادی زندگی کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس ضمن میں ایک سورہ کا ذکر میں خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اسلام کے نزدیک اقتصادی زندگی کا مطمح نظر کیا ہے اور معاشرہ کس طرح کا ہو جس میں فساد اور فتنہ کا امکان ختم ہو جائے۔

یہ سورۂ قریش (۱۰۶) ہے۔ اس میں خدا نے قریش پر اپنے احسانات کو گنوایا ہے۔ یہ احسان دو ہیں۔ بھوک سے اطمینان اور خوف سے امن یعنی ایک اچھے معاشرے میں مجموعی طور پر دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کے تمام افراد کو کھانے اور دیگر ابتدائی ضروریات کی طرف سے اطمینان نصیب ہو اور دوسرے یہ کہ انہیں اپنے مستقبل سے کسی قسم کا اندیشہ نہ ہو اور وہ ہر قسم کے خوف سے محفوظ ہوں۔ یہ دونوں خصوصیات ہر اچھے معاشرے کے لیے ضروری ہیں۔ اور یہی وہ مقاصد ہیں جن کا حصول اسلامی آئین کا مطمح نظر ہے۔

قرآن مجید میں اقتصادی مسائل پر جو زور دیا گیا ہے وہ مسلمانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہا البتہ جب تک مسلمانوں کا معاشرہ ملوکیت کے زیر اثر رہا، عوام اس نظام کے فوائد سے محروم رہے۔ اسلامی تاریخ میں خاص طور پر بنو امیہ کے آخری دور میں جو بغاوتیں ہوتی رہی ہیں وہ اگرچہ مذہبی لباس میں ظاہر ہوئیں لیکن درحقیقت وہ اسی معاشی ناہمواری کا نتیجہ تھیں۔ بعد میں بنو عباس کے لاتے ہوئے انقلاب نے جب عوام کی توقعات کو پورا نہ کیا تو پھر مختلف اطراف سے بغاوتیں رونما ہونے لگیں۔ اس کے علاوہ باطنی تحریکیں اور خود تصوف کی تحریک انہی معاشی بے انصافیوں کے خلاف ایک ردِ عمل کی شکل تھیں۔

سیاسی انحطاط جب اپنے عروج پر تھا تو مسلمانوں میں چند ایسی تحریکیں اٹھیں جن کے سامنے مسلمانوں کی اقتصادی بحالی کا پروگرام تھا۔ اس سلسلے میں برِ عظیم پاک و ہند میں شاہ ولی اللہ (۱۱۱۳-۱۱۷۶ھ / ۱۷۰۲-۱۷۶۲ء) نے جب اسلام کی تعبیرِ نو پیش کرنا چاہی تو انھوں نے اپنے نظامِ فکر میں اقتصادی مسائل کی طرف خاص توجہ کی۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک معاشی انصاف کی اہمیت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اسلام کے فروغ کا بنیادی سبب اس حقیقت کو قرار دیا کہ رومی اور ساسانی حکومتوں کے زیر اثر اس وقت کے متمدن ممالک کے عوام مذہبی اور ملوکیتی استحصال پسند قوتوں کے ہاتھوں بری طرح پس رہے

تھے اور اسلام نے ان مظلوم لوگوں کو ایسے راستے کی دعوت دی جس پر چل کر وہ ان مصائب سے بچ سکتے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے زمانے کی اقتصادی بدحالی کو جس میں عوام بری طرح مبتلا تھے، مسلمانوں کی سیاسی بدحالی کا ذمہ دار قرار دیا اور اس سلسلے میں علما، شعرا، صوفیا اور دیگر ان لوگوں کو تنبیہہ کی ہے جو حکومت کے خزانے پر بار ہیں اور ملک کی اقتصادی خوش حالی میں اضافہ نہیں کرتے۔ شاہ صاحب کی یہ تعبیرِ نو قرآنِ حکیم ہی کی تعلیم کا نتیجہ تھی۔

جب وہابی تحریک نے نجد میں کامیابی حاصل کی تو ذہنی اور اخلاقی انقلاب کے ساتھ ساتھ وہاں بھی اقتصادی مسائل پر پوری توجہ دی گئی۔ جب ریاض میں سعودی مملکت کا قیام عمل میں آیا جسے وہابی تحریک کا دوسرا دور کہنا چاہیے تو عوام کی بہبود کے لیئے زراعتی مراکز قائم کیے گئے جہاں تعاونِ باہمی کے اصول پر کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ ان لوگوں کے لیے "اخوان" کی اصطلاح استعمال کی جانے لگی جو اسلامی اصولِ مساوات کی بہترین عملی شکل تھی۔ یہ اخوان ایک طرف روزمرہ کی زندگی میں اشتراکِ باہمی کے اصول کی روشنی میں کام کرتے تھے اور دوسری طرف جہاد کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ یہ چیز غور کرنے کی ہے کہ روسی اشتراکیت میں جو لفظ کامریڈ رائج ہوا وہ اسی اخوان کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔

اسی طرح شمالی افریقہ میں سنوسی تحریک نے مسلمانوں کی زندگی میں ایک صحت مند انقلاب پیدا کیا۔ اس تحریک کے علمبرداروں نے ملک کے گوشے گوشے میں مرکز (زاویے) قائم کیے۔ جہاں دین اور دنیا دونوں کے مسائل کی طرف توجہ دی جاتی تھی۔ ممبران آپس میں اخوان کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ زاویوں کا مقصد محض دینی تعلیم کا احیا نہ تھا بلکہ لوگوں کی اقتصادی اور معاشرتی زندگی کو بہتر بنانا بھی تھا اور یہی وجہ تھی کہ جہاں جہاں یہ مرکز قائم ہوئے وہاں لوگوں کی دینی حالت کے ساتھ ساتھ ان کی معاشی حالت بھی بہتر ہوتی چلی گئی۔ اور یہ سب کچھ اسلام کی صحیح تعلیم کے احیا کا نتیجہ تھا۔ یہاں یہ حقیقت بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ تمام تحریکیں انقلابِ روس سے بہت پہلے مسلمان ملکوں میں رونما ہو چکی تھیں، جن کے باعث مسلمانوں کی توجہ عوام کے اقتصادی مسائل کی طرف منعطف ہو چکی تھی۔

اقبال نے اپنی عملی زندگی کی ابتدا ہی سے اس مسئلے کی طرف پوری توجہ دی۔ انھوں نے ایک مرتبہ

"قومی زندگی" کے عنوان سے تقریر کی جو ۱۹۰۴ اور ۱۹۰۵ میں مخزن کے دو مختلف شماروں میں شائع ہوئی اِس میں انھوں نے مسلمانوں کی غربت اور افلاس کا تفصیلی ذکر کیا اور اس کے علاج کی طرف توجہ دلائی ہو کہتے ہیں کہ "میں صنعت و حرفت کو قوم کی سب سے بڑی ضرورت خیال کرتا ہوں اور اگر میرے دل کی پوچھو تو سچ کہتا ہوں کہ میری نگاہ میں اس بڑھئی کے ہاتھ جو تیشے کے متواتر استعمال سے کھُردرے ہو گئے ہیں ان نرم نرم ہاتھوں کی نسبت بدرجہا خوبصورت اور مفید ہیں جنھوں نے قلم کے سوا کسی اور چیز کا بوجھ محسوس نہیں کیا"۔

۱۹۱۰ میں اقبال نے علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک لیکچر دیا جو "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے نام سے اردو میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے آخر میں انھوں نے اسی مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے فرماتے ہیں:

"اب میں چند خیالات، اپنی قوم کے غربا کی عام حالت کی اصلاح کے متعلق ظاہر کرتا ہوں۔ اس انحطاط کا حقیقی ذمے دار یہ جان فرسا افلاس ہے جو ہماری قوم کو کھائے جا رہا ہے۔ ہمیں صنعتی تعلیم پر بھی ضرور اپنی توجہ صرف کرنی چاہیے جو میری رائے میں اعلیٰ تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔"

۱۹۰۵ میں بغرض تعلیم انگلستان جانے سے پیشتر انھوں نے ایک کتاب "علم الاقتصاد" کے نام سے لکھی تھی جو پہلی بار ۱۹۰۳ میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں بھی انھوں نے غریب عوام کے مسائل کی طرف پوری توجہ کی اور اپنی طرف سے ان کو حل کرنے کی کوشش بھی کی۔

۱۹۲۲ میں مشہور نظم "خضرِ راہ" انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی تھی۔ اس میں "سرمایہ و محنت" کے عنوان سے دو بند موجود ہیں جن میں سرمایہ اور محنت سے متعلق چند جدید مسائل کی روشنی میں غریب و مزدور کی مصیبتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری اپنی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے اسلام کے عادلانہ نظامِ معیشت سے ٹکراتا ہے۔ اس لیے اقبال نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ سرمایہ دارِ حیلہ گر اور "ساحرِ الموط" کا جو حشر روس میں ہوا یا دوسرے ملکوں میں ہونے والا ہے اس کا ذکر کر کے مزدور کو پیغام دیا کہ وہ اپنی عزتِ نفس کے لیے اٹھ کھڑا ہو:

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

مزدور اگر چاہتا ہے کہ وہ عزت کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرے تو اسے اپنے حقوق کے لیے پوری جدوجہد کرنی چاہیے۔ اب قدیم دور واپس نہیں آسکتا جب سرمایہ دار اور آقا مزدور کو اپنا غلام سمجھتے تھے۔

کوہکن تیشہ بدست آمد و پرویزی خواست

عشرتِ خواجگی و محنتِ لالائی رفت

کوہکن اپنے ہاتھ میں مزدوری کی علامت تیشہ لیے ہوئے میدان میں اتر آیا ہے اور وہ پرویز سے پرویزی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اب وہ دور ختم ہوا جب پرویز اپنے حکم سے کوہکن کو موت کے گھاٹ اتار سکے۔

۱۹۲۳ء کے قریب پیامِ مشرق شائع ہوئی۔ اس میں پہلی بار تفصیل سے سرمایہ اور محنت کی کشمکش اپنے تاریخی پس منظر میں پیش کی گئی۔ عالمِ بالا میں ایک مجلسِ مذاکرہ قائم ہوتی ہے جس میں مختلف مدارسِ فکر کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ روس کا مشہور مصلح ٹالسٹائی سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ استحصال پسند گروہ نے انسانوں کو لوٹنے اور غلام بنانے کے لیے تاج، کلیسا اور وطن کے بُت تراش لیے ہیں اور اس طرح زشت کو نیکی کی شکل میں پیش کیا ہے۔ کارل مارکس ٹالسٹائی کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان اپنے علم و عظمت کے باوجود ظلمت اور جہل سے باہر نہ نکل سکا اور سرمایہ داری کے باعث انسانیت کُش اقدام کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ لیکن اس کائنات کی فطرت ہی کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے کہ تضاد عناصر کے بغیر ارتقا ممکن نہیں۔ ہیگل نے اپنا مشہور فلسفہ پیش کیا کہ آمر و مامور، خواجہ و مزدور، پرویز و کوہکن متضاد عناصر کی حیثیت سے ارتقائے انسانی کے لیے ضروری ہیں۔ ٹالسٹائی سرمایہ داری کی حمایت میں سوفسطائی دلیل سُن کر فوراً پکار اٹھتا ہے کہ یہ فلسفہ خود پرست تو عقل کی تخلیق ہے جو اپنی سرشت میں ابلیسی نہاد ہے۔ کیا اس نظریۂ تصادم کا مطلب یہ ہوا کہ مزدور اپنی قسمت پر شاکر رہے اور اپنی حالت بہتر بنانے کے لیے تگ و دو نہ کرے۔ اس پر ایران کا مشہور حکیم مزدک بول اٹھتا ہے۔

مدتے در آتشِ نمرود می سوزد خلیل

تا تہی گردد حریمش از خداوندانِ پیر

دورِ پرویزی گزشت، اے کشتۂ پرویز خیز

نعمتِ گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر

خلیل مدت تک آتشِ نمرود میں جلتا ہے تب جا کر پرانے بتوں سے حرمِ خداوندی پاک ہوتا ہے سرمایہ

داری کا دور ختم ہو گیا ہے اب وقت ہے کہ مزدور اپنا حق حاصل کر لے گو کہ ان نے سرمایہ دار کے متعلق کیا عمدہ مثال دی ہے:

برون او ہمہ بزم و درون او ہمہ رزم

زبانِ اُوز مسیح و دلش ز چنگیز است

اس کو دیکھا جائے تو بظاہر بڑی دلکش شخصیت رکھتا ہے لیکن اس کا باطن سرتاپا فتنہ و فساد ہے زبان سے عاجزی اور نرمی میں مسیح نظر آتا ہے لیکن اس کا دل چنگیز سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

اقبال زبورِ عجم میں فرماتے ہیں:

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب

از جفائے دہ خدایان کشتِ دہقاناں خراب

سرمایہ دار رگِ مزدور سے دولت کے انبار لگاتا ہے اور خود مزدور کی زندگی افسوس ناک حد تک پریشانیوں اور تکلیفوں کا آئینہ ہے، اور دوسری طرف جاگیردار کے مظالم سے دہقان کی کھیتی برباد ہو چکی ہے۔

لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی اس شدید مخالفت کے باوجود اقبال کو سوشلزم یا اشتراکیت کا نظریہ بالکل پسند نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت میں مغربی تہذیب کی بنیاد چونکہ روحانیت سے انکار پر مبنی ہے، اس لئے سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت دونوں خدا بیزاری پر قائم ہیں۔ اقبال کے نزدیک یہ خدا بیزاری مستقبل کی تہذیب کے لئے ایک بڑا خطرہ ہے نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ عیسائیت کے لیے بھی:

من از ہلال و چلیپا دگر نیندیشم

کہ فتنۂ دگرے در ضمیرِ ایّام است

"یہ فتنۂ دگرے" سوائے سوشلزم کے کوئی نہیں۔ چونکہ یہ دونوں نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت مغربی تمدن ہی کی پیداوار ہیں اس لیے اس قابل نہیں کہ ان سے انسانوں کے مسائل صحیح معنوں میں حل ہو سکیں۔ خدا بیزاری کی بنیاد پر جو نظام بھی قائم ہوگا اس میں خود غرضی سے بلند ہونا ممکن ہی نہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فتنہ و فساد کے نئے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ صحت مند انقلاب کے لیے ضروری ہے کہ بنیادی رُوح تبدیل کر دی جائے قرآن مجید (۱۲-۱۸) میں خدا فرماتا ہے کہ:

جو لوگ اپنا نقطہ نظر اس ناپائدار اور عارضی دنیا تک محدود رکھتے ہیں تو ان کو اس دنیا میں چند روز کے لیے راحت میسر ہو جاتی ہے لیکن آخر کار اس کا نتیجہ سوائے جہنم کی سی زندگی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

دوسرے لفظوں میں صحت مند ارتقا کے لیے ضروری ہے کہ انسانوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ اسی نقطے کو قرآن مجید اگلی آیت میں یوں واضح کرتا ہے۔

جو شخص آخرت کو نگاہوں کے سامنے رکھتا ہے اور اس کے لئے اس کے مطابق کوشش کرتا ہے اور پھر وہ مومن ہے اس کو ان حقائق پر پختہ یقین ہے تو ایسے لوگوں کی کوشش یقیناً مقبول ہو گی

اس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف وہ اقتصادی نظام صحیح طور پر امن کا علمبردار ہو سکتا ہے جس کی بنیاد روحانی اور اخلاقی اقدار پر قائم ہو اور پھر عدل و مساوات قائم کر سکے۔ اس کی غیر موجودگی میں اشتراکیت کا دعویٰ مساوات لایعنی ہے۔ اسی نقطۂ نگاہ کی تشریح اقبال نے پیامِ مشرق کی ایک نظم "موسیولینن و قیصرِ ولیم" میں کی ہے۔

لینن انسانیت کی درد بھری کہانی بیان کرتا ہے کہتا ہے کہ بد قسمتی سے یہ انسان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پستا رہا ہے کبھی زاروں سے فریب کھایا اور کبھی قیصروں سے اور کبھی کلیسا کے دام میں پھنسا رہا لیکن آخر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس بھوکے انسان نے آقا کی قمیص کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اس قمیص کے جو ہمارے خون سے رنگین تھی۔ جمہور کی آگ کے شعلوں میں نہ پیرِ کلیسا کی چادر بچ سکی اور نہ سلطان کی قبا محفوظ رہ سکی۔

لیکن قیصر ولیم (شہنشاہ جرمنی) نے لینن کی اس منطق کا بہت عمدہ جواب دیا۔ برہمن کی سرشت میں بتوں کی پرستش لکھی ہے اور وہ اپنی فطرت کی رُو سے مجبور ہے کہ بتوں کے ناز اٹھائے۔ وہ پرانے دیوتاؤں سے بہت جلد بیزار ہو جاتا ہے اور اسی لیے اپنی طبیعت کو خوش کرنے کے لیے نئے بُت تراش لیتا ہے۔ آپ شکایت کرتے ہیں کہ رہزن قافلوں پر حملہ کر کے لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ یہ قافلے والے حقیقت میں خود رہزن بھی ہیں۔ اگر بادشاہی نظام ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ جمہوریت قائم کر دی جائے تو یقین کیجیے کہ عام لوگوں کے حالات میں کوئی خوش گوار تبدیلی نہیں ہو گی اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آدم کے دل سے ہوس ختم نہیں ہوتی اور وہ مختلف موقعوں پر مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ شیریں کی ناز برداری ہوتی رہے گی۔ اگر پہلے یہ کام پرویز سرانجام دیتا تھا

تو اب یہی کام کوہکن کے ہاتھوں انجام پذیر ہوگا:

نماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

جاوید نامہ میں اشتراکیت پر بحث کرتے ہوئے اقبال نے کارل مارکس کا ذکر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مارکس کے ہاں حق موجود ہے مگر بدقسمتی سے یہ حق باطل میں مل کر غلط ہوگیا ہے۔ مارکس کا یہ کہنا تو صحیح ہے کہ مزدور کا استحصال ہوتا رہا ہے اور اسے حق پہنچتا ہے کہ اس کے مسائل کی طرف توجہ کی جائے اور اس کی حیثیت بہ حیثیت انسان بحال کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن چونکہ مارکس نے اس نقطۂ نگاہ کو اس زمانے کے مادیت پسند ماحول کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس لیے اقبال کا خیال ہے کہ اشتراکیت انسانی مصائب کا حل نہیں اس لئے تمام نقائص مغربی تمدن سے ورثے میں پاتے ہیں اور خاص طور پر خدا بیزاری کا غیر عقلی نظریہ:

غربیاں گم کردہ اند افلاک را
در شکم جویند جان پاک را

یہاں افلاک سے مراد روحانی نقطۂ نگاہ ہے اور اس کی کمی مغرب کے ہر نظام میں موجود ہوگی خواہ وہ اشتراکیت ہو یا ملوکیت جمہوریت ہو یا آمریت:

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب — ہر دو یزداں ناشناس، آدم فریب
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل — ہر دو را تن روشن و تاریک دل

مغربی تہذیب کا ہر نظام چونکہ خدا بیزاری پر مبنی ہے اس لئے اس کا نتیجہ آدم فریبی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ دل جو خدائے برتر و قدوس کی آماجگاہ ہے، تاریک اور ناصبور ہے اور اس کے مقابلے میں انسان کا جسم بظاہر تر و تازہ ہے لیکن اس کا نتیجہ دنیا میں فتنہ و فساد کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔

اس کا صحیح علاج ہمیں قرآن حکیم کی تعلیمات میں حاصل ہوتا ہے جو ایک ایسے معاشی نظام کا علمبردار ہے جس سے قوم کے ہر فرد کو انصاف میسر ہو سکتا ہے۔ معاشی انصاف اور مستقبل

کی طرف سے بے خوفی اس سلسلے میں اقبال کا ایک توضیحی بیان مفید مطلب ہے۔ اخبار "زمیندار" کی کسی اشاعت میں ایک شخص نے اشتراکیت کی حمایت کرتے ہوئے اقبال کے متعلق لکھ دیا کہ وہ اشتراکیت کے پُرجوش حامی ہیں۔ اس پر اقبال نے اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ "میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ روسی باشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیشی اور خودغرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردعمل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی باشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے۔ اسلام سرمایہ کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرتِ انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے لیے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ میرا عقیدہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی آیت فاصبحتم بنعمتہ اخوانا[1] میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے، جب تک وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں جس کا مقصد سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو۔"[2]

ایک مشہور حدیث بیان کی جاتی ہے کہ جب اسلام اس روئے زمین پر پہلی دفعہ آیا تو وہ غریب تھا

---

[1] قرآن حکیم کی یہ آیت سورہ آل عمران (۱۰۳) میں آئی ہے جہاں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اللہ کی رسی یعنی قرآنِ حکیم کو مضبوطی سے تھامے رکھیں۔ خدا کی نعمت کا شکریہ ادا کریں کہ وہ آپس میں دشمن تھے اس نے اپنے کرم سے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت پیدا کر دی اور وہ بھائی بھائی بن گئے۔

اس آیت میں لفظ "اخوان" بڑا معنی خیز ہے۔ اسی لفظ کو اصطلاح کے طور پر سعودی عرب کے وہابیوں اور شمالی افریقہ کے سنوسی مصلحوں نے مسلمانوں کے لیے استعمال کیا۔ حقیقت میں اسلام کے سامنے لوگوں کے باہمی رشتے کے لیے اس سے بہتر اصطلاح ممکن ہی نہیں اور جیسا کہ اقبال نے کہا ہے یہ مساوات محض قانونی ہی نہیں بلکہ معاشی بھی ہے۔

[2] محمد رفیق افضل (مرتب) گفتارِ اقبال (لاہور ۱۹۶۹) صفحہ ۶-۷

اور ایک دور آنے والا ہے جب وہ پھر غریب ہوگا۔ "غریب" کے صحیح مفہوم کے تعین میں اختلاف رہا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ "غربتِ دیں سے مراد ندرتِ آیات ہے"۔ یعنی قرآن حکیم کی آیات میں جہانِ معنی مضمر ہے۔ ہر دور کا انسان ان الفاظ سے صرف وہ معنی حاصل کرتا ہے جو اس کے مبلغ علم کے مطابق ہوں اور جب انسانی علم کی حدود پھیل جاتی ہیں اور انسان نئے علوم سے دوچار ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن حکیم کی آیات، پہلے سے مختلف معانی لیے ہوئے ہیں۔ اقبال کے نزدیک آیات کی یہ نئی نئی تعبیریں جو زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہوں حدیثِ مذکورہ میں "غریب" کی اصطلاح سے بیان کی گئی ہیں:

غربتِ دیں ہر زماں نوعِ دگر — نکتہ را دریاب اگر داری نظر
دل بآیاتِ مبیں دیگر بہ بند — تا بگیری عصرِ نو را در کمند

روسیوں نے ایک نئے نظام کی طرح ڈالنے کا پروگرام بنایا ہے مگر بدقسمتی سے انھوں نے اپنا تعلق حق سے منقطع کر لیا ہے حالانکہ صحیح مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ

حق ببیں حق گوئے و غیر از حق مجوئے

حق کو دیکھا جائے، حق کہا جائے اور سوائے حق کے کسی کی تلاش نہ کی جائے۔

جمال الدین افغانی کی زبان سے روسیوں کو قرآن کی تعلیم کے چند اصولوں سے یوں روشناس کراتے ہیں۔ تم نے ہم مسلمانوں کی طرح شہنشاہیت کا خاتمہ کر دیا لیکن اگر تم اپنے دل میں یقین کا چراغ جلانا چاہتے ہو تو ہماری تاریخ سے عبرت حاصل کرو۔ ملوکیت کے اس بت و بیل کے اردگرد مت چکر لگاؤ۔ اس دنیا کو ایک ایسی نئی ملت کی ضرورت ہے جو انسانوں کے لیے نذیر بھی ہو اور بشیر بھی۔ اس کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ اپنا رشتہ مغربی تہذیب سے بالکل منقطع کر لو۔ بدقسمتی سے نئی تہذیب ایک خاص قسم کے لادینی نظام سے وابستہ ہو گئی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم آئندہ کے لیے اپنی تقدیر مشرق سے وابستہ کر لو۔ فرنگ کا نظام اب ختم ہونے کو ہے اور اس کا احیا ناممکن ہے۔ تم نے ملوکیت اور سرمایہ داری کو ختم کیا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ لا سے الا کی طرف رجوع کیا جائے۔ لا حرکت اور انقلاب ہے لیکن اگر ثبات چاہتے ہو تو الا کے بغیر چارہ نہیں۔

لیکن اہم سوال یہ ہے کہ اس نئے نظام کے لیے "محکم اساس" کون سی ہے؟ نیا نظام محض منفی نعروں اور سلبی رجحانات پر قائم نہیں رہ سکتا۔ محض سرمایہ داروں اور ملوکیت کے علمبرداروں کے خلاف زہر اگل کر تو پائدار مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر تم واقعی اپنی تلاش میں مخلص ہو اگر حقیقی طور پر پرانے نظام کی جگہ ایک نئے

نظامِ معیشت چاہتے ہو تو پھر ام الکتاب ہی وہ واحد منبع ہے جہاں سے تمہیں روشنی مل سکتی ہے۔ یہ اسی ام الکتاب کی رہنمائی تھی جس نے عمر و علی کو ایک نئے صحت مند معاشرہ کی تشکیل میں مدد دی تھی۔ نسل، رنگ اور وطنیت کے بُت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاش پاش ہو گئے بادشاہت ایک خوابِ دیرینہ بن کر رہ گئی۔

مغرب میں طاقت کا منبع جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ اخلاقی تقاضوں سے بالکل عاری ہیں اور اسی لیے انھوں نے مکر و فریب کو بطور مسلک اختیار کیا ہے لیکن بہتر ہے کہ مغرب کی حکمتِ عملی کو کلی طور پر ترک کر دیا جائے۔ روباہی کی بجائے شیری اختیار کی جائے حیلہ و مکر چھوڑ کر سیدھا سادھا راست گوئی کا طریقہ اپنایا جائے۔ طاقت کی اصل بنیاد فقر ہے جو ذکر اور فکر دونوں کی ہم آہنگی کا نام ہے اور جب طاقت یا سلطانی بہ اصطلاح قدیم ان دونوں اجزا کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہو تو اسے خلافت کا نام دیا جاتا ہے۔ خلافت کے متعلق اقبال نے ارمغانِ حجاز میں کہا ہے:

خلافت بر مقامِ ما گواہی است — حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ — خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

ملوکیت مکر اور دھوکا ہے اور خلافت خدائی قوانین کی حفاظت کا نام ہے۔ چونکہ تم ایک نئی دنیا کی تعمیر چاہتے ہو اس لیے بہتر ہے کہ قرآن حکیم کے اندر غوطہ لگاؤ اور اس کے نورِ جاں آفرین سے روشنی اور ہدایت حاصل کرو۔ جو طاقت اس منبع سے حاصل ہو گی وہی پائدار ہو گی:

حاکمی بے نورِ جاں خام است خام — بے یدِ بیضا ملوکیت حرام

اگر ایک نظامِ عالم اپنی افادیت کھو چکا ہے تو اس کی جگہ ایک نیا نظام قائم کیا جا سکتا ہے اور اقبال نے کئی جگہ اس خیال کو دہرایا ہے کہ قرآن حکیم ہر زمانے کے مطابق نیا نظام پیش کرتا ہے:

تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست — زانکہ تقدیرات حق لاانتہاست

خدا نے انسانوں کے لیے ہزاروں تقدیریں تیار کر رکھی ہیں آج اگر ایک تقدیرِ حق انسانوں کے لیے موافق نہیں تو دوسری تقدیر آزمائی جا سکتی ہے اور یہ نئی تقدیر قرآن حکیم کے اوراق کے اندر محفوظ ہے:

صد جہان تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش

قرآن کی آیاتیں سینکڑوں جہاں مضمر ہیں۔ اگر تمہیں شوق ہو اور صورت کے نیچے معنی تک رسائی ہو تو ان سینکڑوں جہانوں میں سے ایک جہان ہمارے زمانے کے لیے کافی ہے۔ جب کبھی کوئی نظامِ زندگی اپنی افادیت کھو دے تو قرآن حکیم سے ایک نئے نظام کا خاکہ حاصل کیا جا سکتا ہے جو قدیم انسانی اقدار کی بنیاد پر نئے تقاضوں کو بڑی خوبی سے پورا کرتا ہے۔

اقبال نے اس دورِ جدید کے لیے ایک نئے معاشرے کا خاکہ پیش کیا ہے اس نئے معاشرے کے لیے اس کی نگاہ میں چار بنیادی عناصر کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ خلافتِ آدم پہلا بنیادی اصول تکریمِ آدم کا ہے۔ یعنی جو بھی نظام قائم کیا جائے اس کی بنیاد اس اصول پر ہونی چاہیے کہ کسی انسان کو دوسرے انسانوں کو بطور ذریعہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ہر انسان اپنی مخصوص خودی کا حامل ہے جس میں کچھ صفات مضمر ہیں ان صفات کو پوری آزادی سے پھلنے پھولنے کا موقعہ نصیب ہونا چاہیے۔ وہ خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے ایک بلند مقام کا حامل ہے اور کسی طرح بھی اس میں فرق نہیں آنا چاہیے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں انسان کا استحصال اور اس کی آزادی پر ناروا پابندیاں عائد کرتے ہیں اور اس لیے وہ خلافتِ آدم کے اصول کے منافی ہے اسی طرح جدید نظریۂ وطنیت انسانی عظمت کے منافی ہے۔ اس کی رو سے عزتِ تکریم کی حامل انسان کی ذات نہیں بلکہ ایک خاص خطۂ زمین ہے یا ایک خاص نسل ہے جس کی خاطر انسان کو قربان کیا جا سکتا ہے:

برتر از گردوں مقامِ آدم است　　اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

ایک بیان میں اقبال نے اس مسئلے کو زیادہ واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں "دراصل انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے اور جب تک دنیا کی علمی قوتیں اپنی توجہ کو احترامِ انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی رہے گی۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو رنگ، نسل و زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا اور

اخوت و حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔

۲۔ اس نئے معاشرے کا دوسرا اہم اصول حکومت الٰہیہ ہے یعنی ریاست کے لیے قانون کی بنیاد محض عقل انسانی کی مدد سے نہیں رکھی جا سکتی۔ یہاں سوال عقل اور وحی کے مقابلے کا ہے کیا انسانی بہبود کے کام کے لئے ہمیں عقل کے علاوہ کسی اور رہنمائی کی ضرورت نہیں۔

اقبال کا خیال ہے کہ عقل خود بین ہوتی ہے اس لیے اپنے فائدے کے علاوہ کوئی اور راستہ اسے سجھائی نہیں دیتا۔ پس چہ باید کرد میں فرماتے ہیں:

آدمی اندر جہان خیر و شر | کم شناسد نفع خود را از ضرر
کس نداند زشت و خوب کار چیست | جادۂ ہموار و ناہموار چیست

اس دنیائے خیر و شر میں انسان بہت کم اپنا صحیح نفع نقصان سمجھ پاتا ہے۔ اس کے لیے اس بات کا تعین کتنا مشکل ہے کہ بری چیز کون سی ہے اور اچھی کون سی اور کس راستے پر چلنا چاہیے اور کس راستے سے بچنا چاہیے۔

ایسی حالت میں خدا نے انسان کی رہنمائی کے لیے وحی کا انتظام کیا ہے جب آدم سے غلطی ہوئی اور پھر اسے اس کا احساس ہوا تو اس نے معذرت کی اور آئندہ احتیاط سے قدم اٹھانے کا وعدہ کیا۔ ہبوط آدم کے بعد خدا نے کہا۔ یقیناً میری ہی طرف سے تمہارے لیے ہدایت آتی رہے گی۔ جس شخص نے اس ہدایت کی پیروی کی وہ خوف و حزن سے محفوظ ہوگا۔ (۲، ۳۸)

یہ وحی خداوندی ہر قسم کی کجی سے پاک ہے اس کے سامنے تمام انسانوں کی بھلائی ہے اس لیے کہ اس کا مطمع نظر مکمل عدل و انصاف ہے۔ ایسی حالت میں اقبال کا خیال ہے کہ ایک نصب العینی حکومت کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد وحی خداوندی کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق ہو۔ حکومت کا حق صرف خدائے قدوس و برتر کے لیے ہے:

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے | حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

اور جب کوئی ریاست خدا کے قانون کے علی الرغم قائم ہوگی تو وہ بتان آذری کی حکومت ہوگی جس کا پاش پاش کرنا اخلاف خلیل اللہ کا مقدس فریضہ ہے کیونکہ اس نظام کا نتیجہ زور زر اور جابر کا تسلط ہوگا اور غریب و ناتواں پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے جائیں گے۔

غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود | زور ور بر ناتواں قاہر شود
زیرِ گردوں آمری از قاہری است | آمری از ماسوا اللہ کافری است

یعنی جب ریاست کی تعمیر حق تعالیٰ کے قانون سے ہٹ کر اٹھائی جائے گی تو ہر طرف ظلم و ستم کا دور دورہ ہوگا۔ ماسوا اللہ کی آمری درحقیقت انکارِ خداوندی ہے۔ بُت پرستی ہے۔ توحید اور اسلام کے انکار کے مترادف ہے۔

مغرب کے جمہوری نظام کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں عوام کو ریاست کے انتظام میں حصہ دار سمجھا جاتا ہے اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ حکومت کے نظام میں ان کا پورا پورا دخل ہے۔ لیکن اگر اس جمہوریت کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظام عوام کی بہبودی کی خاطر پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کا باعث چند سرمایہ داروں کی کوشش تھی جس کے باعث وہ بادشاہوں کے اقتدار سے بچ کر اپنی استحصالی کارروائیوں میں آزادی کے خواہش مند تھے۔ انھوں نے جب بادشاہوں کے اقتدار کے خلاف بغاوت کرنا شروع کی تو اپنی تحریک کے لیے عوامی تائید حاصل کرنے کے واسطے نعرہ بلند کیا کہ یہ تحریک بادشاہوں سے اقتدار چھین کر عوام کے حوالے کرنے کے لیے اٹھائی گئی ہے۔ یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ اس کا مقصد محض سرمایہ دار کے مفاد کی حفاظت تھی۔ جمہوریت کی طرح قومیت کا نعرہ بھی انہی سرمایہ داروں کا حربہ ہے جس سے وہ عوام کو اپنے سرمایہ دارانہ اور ملوکیت پسندانہ مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اگر اقبال نے مغربی جمہوریت کی تنقیص کی ہے تو اسی نقطۂ نظر سے۔ چنانچہ بانگِ درا میں کہتے ہیں:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام | جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب | تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق | طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں! | یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

"نیو ایرا" (۲ جولائی ۱۹۱۷) میں اقبال نے "مسلم جمہوریت" کے زیرِ عنوان مغربی جمہوریت کے متعلق اپنے اس نظریے کو واضح کیا ہے۔ نیٹشے عوام سے متنفر تھا اور وہ اس جمہوریت کے مقابلے میں فوق البشر کی حکومت کا خواہش مند تھا۔ لیکن اقبال اس سے بھی متفق نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام کے

ابتدائی دور کا تجربہ نیٹشے کی مکمل تردید کرتا ہے۔ کہتے ہیں "اسلامی جمہوریت کا آغاز کسی اقتصادی ضروریات کے زیر اثر نہیں ہوا ہے بلکہ یہ ایک روحانی اصول ہے جو اس مفروضے پر مبنی ہے کہ ہر ایک انسان ایسی قوتوں کا مرکز ہے جو ایک خاص قسم کی سیرت کی تشکیل سے بروئے کار آتی ہیں۔ اسلام کی تعلیم سے عوام میں سے ایسے افراد ظاہر ہوئے جو زندگی کی بہترین قوتوں کے علمبردار تھے۔ یہ عملی مثال نیٹشے کے نظریات کی تردید کے لیے کافی ہے۔"

صحیح جمہوری نظام وہ نظام ہے جس کی بنیاد قوانین الٰہیہ پر رکھی گئی ہو۔ جہاں سرمایہ داری حرام مطلق ہو اور جہاں طاقتور اور کمزور قانون کی نگاہ میں یکساں ہوں۔ مغرب کے سیاسی نظام محض سراب ہیں اور آب حیات کی اگر تلاش ہے تو وہ قرآن حکیم سے حاصل ہو سکتا ہے:

اے بہ تقلیدش اسیر، آزاد شو　　دامن قرآں بگیر آزاد شو

۳۔ اس نصب العینی ریاست کا تیسرا اصول قرآن مجید کی آیت (۷، ۱۲۸) میں مذکور ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ زمین خدا کی ہے یعنی الارض للہ یہ آیت ایک طرح جاگیرداری نظام کے خلاف ایک بیّن دلیل ہے۔ یہ زمین خدا کی ہے یعنی عام انسانوں کے مفاد کی خاطر استعمال کی جانے چاہیے۔ اس پر کسی ایک شخص یا اشخاص کا خصوصی حق نہیں۔ اسی طرح قرآن حکیم میں آتا ہے ان الحکم الا للہ (۱۲، ۴۰) یعنی حکم اور اختیار صرف اللہ کے لیے ہے لیکن اس کا مفہوم یہ نہیں کہ لوگوں کے پاس حکم اور اختیار نہیں ہونا چاہیے۔ مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو جو حکم، اقتدار اور اختیار حاصل ہے وہ خدا کی طرف سے ایک امانت ہے۔ جب لوگ اقتدار پر قابض ہوں تو وہ خدا کے قوانین کے ماتحت رہ کر اس کو استعمال کریں۔ اسی طرح جب قرآن حکیم یہ کہتا ہے کہ زمین اللہ کی ہے تو مراد یہ ہے کہ زمین ایک امانت ہے اور عوام کی خاطر اس طرح استفادہ کیا جائے جس طرح قرآن مجید نے ہدایت کی ہے۔

اقبال کہتے ہیں:

سرگزشت آدم اندر شرق و غرب　　بہر خاکے فتنہ ہائے حرب و ضرب

اگر اس دنیا میں انسانیت کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تمام فتنہ و فساد کا باعث صرف یہی زمین ہے۔ قدیم فارسی مقولہ ہے کہ اس دنیا میں فساد کا موجب تین ہیں زر، زن اور

زمین۔ مگر اقبال ان میں سے دو کو رد کرتے ہوئے صرف زمین کو موجب فساد قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس سے مراد یہ نہیں کہ زمین سے استفادہ منع ہے بلکہ ان کی مراد محض یہ ہے کہ زمین پر ایسا قبضہ جو عوام کے مفاد کے خلاف ہے فساد کا باعث ہے۔

انسان اور اس عالم کون و مکاں کا تعلق ایک عارضی شے ہے۔ وہ زندگی کے سفر پر رواں ہے سفر میں زاد راہ ہلکا پھلکا ہونا بہتر ہے۔ یہ سنگ و حجر اسباب سفر کے لیے موزوں نہیں اس کے لعد جاگیردار سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

حق زمیں را جُز متاعِ ما نگفت | ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا! نکتہ از من پذیر | رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

یہ زمین انسانوں کی پونجی ہے جو خدا کی طرف سے ہمارے لیے مفت مہیا کی گئی ہے۔ اے زمیندار میری بات سُن تو اس سے اپنا رزق حاصل کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اور جب تجھے موت آئے تو اس میں دفن ہونے کا حق بھی رکھتا ہے لیکن اس سے زیادہ تجھے کوئی اختیار نہیں کہ اس پر غاصبانہ قبضہ کرلے اور دوسروں کو اس سے فائدہ حاصل کرنے سے محروم کر دے۔

مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ایک صحابی سے وہ زمین چھین لی جو خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو دے رکھی تھی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اس زمین کو کاشت نہ کر سکتا تھا اور وہ بے کار پڑی تھی۔ حضرت عمرؓ نے صرف اس لیے اس زمین کو بحق سرکار ضبط کر لیا کہ دوسرے لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔ قرآن مجید (۲، ۳۶) میں جب آدم کو زمین پر اترنے کا حکم دیا گیا تو اس کے ساتھ کہا گیا کہ اس زمین کو کچھ عرصے کے لیے تمہارے لیے مستقر بنایا گیا ہے اور اسی جگہ تمہارے لیے "متاع" سامانِ معیشت مہیا کیا گیا ہے۔ اسی آیت کی روشنی میں اقبال نے زمین کو "متاعِ ما" کا نام دیا ہے۔ ایک دوسری جگہ (۱۶، ۸۰) قرآنِ حکیم عربوں کو اپنے احسانات یاد دلاتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے تمہیں اپنے لیے مکان بنانے آسانی سے رکھے جانے والے خیمے مہیا کرائے جو جانوروں کی کھالوں سے بنائے جاتے ہیں۔ پھر ان جانوروں کے بال اُون وغیرہ سے تم بے شمار فائدے حاصل کرتے ہو۔ یہ تمام اشیا بقول قرآنِ حکیم "متاع" ہیں۔

ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس دنیا کی ہر شے خدا کی طرف سے ایک عطیہ ہے جس کا استعمال صرف انفرادی فائدے کے لیے ہو تو معاشرے کے لیے بہت سی مشکلات کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہ تمام زمین اور آسمان اور جو کچھ ان میں ہے وہ تمام انسانوں کے فائدے کے لیے ہے اور اسلام چاہتا ہے کہ حکومت ایسا انتظام کرے کہ لوگ ان کے فوائد سے محروم نہ ہو سکیں۔ وہ نظامِ حکومت یقیناً ناقابلِ برداشت ہے جس میں عوام کو ان سے استفادہ کرنے کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ قرآن مجید (سورہ ۱۰۷) میں ان لوگوں کے "ویل" یعنی تباہی کی وعید آئی ہے جو لوگوں کو ان اشیا کے فوائد حاصل کرنے سے روکتے ہیں یمنعون الماعون۔ ماعون کو صرف زکوٰۃ تک محدود رکھنا قرآنی مفہوم کی وسعت اور اس کی روح کے خلاف ہے۔

اقبال کا خیال ہے کہ جب قرآنِ مجید نے زمین کو "متاع" قرار دیا اور پھر دوسری جگہ اسے "للہ" کے الفاظ سے یاد کیا تو اس سے یہی مراد ہے کہ اس کا استعمال جاگیردارانہ طور پر غلط ہے یعنی اس سے انتفاع کا حق صرف ایک شخص یا چند شخصوں تک محدود رہنا مناسب نہیں۔

اسی مسئلے کو اقبال نے جاوید نامہ میں حکیمِ مریخی کی زبان سے بیان کیا ہے۔ حکیمِ مریخی زندہ رود سے کہتا ہے کہ ہماری دنیا میں کوئی شخص سائل اور محروم نہیں، نہ کوئی عبد ہے نہ مولا، نہ حاکم ہے نہ محکوم۔ زندہ رود حیران ہو کر سرمایہ دار سے متاثر انسان کی زبان سے کہتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سائل و محروم تو تقدیرِ حق ہے۔ اگر ایک طرف حاکم ہے تو اس کے مقابلے میں محکوم ہوگا۔ اگر امیر ہے تو غریب بھی ہوگا۔ اس کے بغیر تو چارۂ کار نہیں۔ خدا نے انسانوں کا نظام ہی کچھ اس طرح کا بنایا ہے۔ اس پر حکیمِ مریخی خوب جواب دیتا ہے کہ تقدیرِ خداوندی کسی ایک نظام کی پابند نہیں۔ اگر اس نظام سے دنیا کے لوگوں کو چین و سکون نصیب نہیں تو اس کو ختم کر کے ایک دوسرا اور بہتر نظام قائم کیا جا سکتا ہے اور اس میں خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی۔

تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست — زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہا ست

اس موجودہ نظام میں سب سے زیادہ موجبِ فساد یہ نظریہ ہے کہ ہم نے اس "زمین" کو متاعِ الیٰ حین سمجھنے کی بجائے اس پر مستقل قبضہ جما لیا ہے اور لوگوں کو اس سے محروم کر رہے ہیں اور اس طرح یمنعون الماعون (۱۰۷، ۷) کی فہرست میں شامل ہو رہے ہیں جن کی خدا نے سخت مذمت کی ہے

اے کہ می گوئی متاعِ ما ز ماست مردِ ناداں ایں ہمہ ملک خداست
ارضِ حق را ارضِ خود دانی، بگو چیست شرح آیۂ لَا تُفْسِدُوْا
زیرِ گردوں فقر و مسکینی چرا است آنچہ از مولاست می گوئی ز ماست

یہ زمین خدا کی ہے، اور خدا کی مِلک ہے، اس پر اپنا قبضہ جتانا غلط بات ہے اور اسی وجہ سے زمین پر فتنہ و فساد ظاہر ہو رہا ہے۔ اگر زمین کی حقیقت کو سمجھ لو تو یقین رکھو اس دنیا سے فقر و مسکینی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔

بالِ جبریل میں "الارض للہ" کے عنوان سے نظم میں اقبال نے اللہ تعالےٰ کی قوتِ رزاقی اور ربوبیت کا تذکرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ زمین سے پیداوار کس طرح ہوتی ہے؟ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زمین میں بیج کا نشوونما، بادلوں کا پانی برسانا، سورج کی تپش اور روشنی، موسموں کا تغیر و تبدل، یہ سبھی کردگارِ مطلق کی بخشش کا نتیجہ ہیں۔ اس لیے ہمیں زمین کے فوائد میں سب لوگوں کو شامل سمجھنا چاہیئے:

دہِ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

جاوید نامہ میں اقبال نے اس قرآنی بیان کے باطنی مفہوم کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ قرآن حکیم (سورہ ۲۸ آیات ۷۶، مابعد) میں قارون کا ذکر ہے۔ جس کی بے شمار دولت نے اسے مغرور بنا دیا تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا:-

> اس دولت سے جو اللہ نے تمہیں دے رکھی ہے، آخرت کے لیے بھی انتظام کرو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم دنیا میں اپنا حصہ فراموش کر دو۔ دوسروں سے حسنِ سلوک کرو جس طرح اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے۔ زمین میں فساد پھیلانے کا باعث نہ ہو۔ خدا مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس آیت سے چند حقائق واضح ہوتے ہیں۔ دولت فی نفسہ بری شے نہیں۔ اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔ دوسروں سے حسنِ سلوک کیا جا سکتا ہے۔ سائل و محروم کی محرومیاں دور کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر اس دولت کو محض ایک شخص اپنی نمود و نمائش کے لیے استعمال کرے، جیسا کہ آیت ۷۸ سے واضح ہوتا ہے اور گھمنڈ کرے کہ یہ دولت تو اس کی اپنی قوت اور

علم سے حاصل ہوتی ہے تو یہی موجب فساد ہے۔ اگر ار دگرد لوگ بھوک اور پریشانی میں مبتلا ہوں اور وہ اپنی ذات میں مگن رہے تو یہی فساد فی الارض ہے۔

مشہور ہے کہ ایک دفعہ ابراہیم بن ادہمؒ کسی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کے خیمے سونے کے میخوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ایک صوفی ان سے ملنے آئے۔ ان میخوں کو دیکھ کر وہ گھبرا گئے۔ ابراہیم بن ادہم سے اپنی الجھن بیان کی۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ میخیں زمین میں گڑی ہوئی ہیں، میرے دل میں نہیں۔ اسلام نے دنیا کی دولت سے اسی طرح کا تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہی اقبال کے نزدیک الارض للہ کا باطنی مفہوم ہے۔ یعنی اس زمین پر رہتے ہوئے "زمین پیوستگی" (Earth - Rootedness) سے بچے رہیں۔ فرماتے ہیں کہ میرا مطلب یہ نہیں کہ ان محلات اور ساز و سامان کو چھوڑ دو۔ یہ دنیا اور اس کی زیبائش زندگی کا لازمہ ہیں اور تسخیر کائنات انسان کا فرض ہے لیکن یہ سب کچھ کرنے کے بعد "طریق آذری" سے محفوظ ہونا ضروری ہے:

من نگویم درگذر از کاخ و کو دولت تست ایں جہان رنگ و بو

لیکن

دل برنگ و بو و کاخ و کو مدہ دل حریم اوست جز با او مدہ

جب تک دل کا رشتہ خدائے قدوس سے قائم ہے دنیا کا سامان نقصان دہ نہیں اور اس نکتہ کو الارض للہ کہنے سے واضح کیا گیا ہے۔

۴۔ اس نصب العینی معاشرے کا چوتھا اور آخری اصول علم و حکمت کا اکتساب ہے علم و حکمت کے بغیر کوئی معاشرہ تسخیر کائنات کے مقصد سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ العلم حجاب الاکبر یعنی علم حجاب اکبر ہے۔ اگر علم کی تحصیل کے ساتھ انسان کے سامنے روحانی نصب العین موجود ہو تو یہ علم اس کے لیے موجب برکت ہوتا ہے۔ اگر بدقسمتی سے یہ نصب العین آنکھوں سے اوجھل ہو جائے تو علم حقیقی طور پر حجاب اکبر ہو جاتا ہے۔ مولانا روم کا شعر ہے:

علم را بر دل زنی یارے بود علم را بر تن زنی مارے بود

یعنی اگر علم اور دل باہم پیوستہ ہوں تو وہ علم مشکلات کا حل ہے اور اگر علم اور دل کا تعلق منقطع ہو جائے تو ایسا علم انسان کے مستقبل کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ اقبال نے اسی کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے:

دل اگر بندد بہ حق پیغمبری است ور ز حق بیگانہ گردد کافری است
علم را بے سوزِ دل خوانی شر است نورِ او تاریکیٔ بحر و بر است

اگر علم کا تعلق حق سے ہو تو یہی پیغمبری ہے جس کی خصوصیات میں "علم و حکم" کا خاص طور پر قرآن مجید نے ذکر کیا ہے (۱۲-۲۲-۲۱-۷۴) اگر یہ تعلق منقطع ہو جائے تو یہی علم ابلیسی صفات اختیار کر لیتا ہے اور بحر و بر کے لیے تاریکی کا باعث بنتا ہے۔ اور ایسا علم خطرناک ہوتا ہے اقبال کہتے ہیں:

علمِ بے عشق است از طاغوتیاں علم با عشق است از لاہوتیاں

اقبال نے اس نصب العینی معاشرے کے بنیادی اصول بیان کر دیے ہیں۔ انھوں نے "پس چہ باید کرد" میں اسرارِ شریعت کے عنوان سے اس نقطۂ نگاہ کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب تک شریعتِ اسلامیہ کی پیروی نہ کی جائے گی پائدار امن جس کی بنیاد صحیح سماجی انصاف پر ہے حاصل نہیں ہو سکتا:

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم تا کجا در حجرہ می باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کُن نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کُن
کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

اس شریعت کا مقصد یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی شخص کسی شخص کا محتاج نہ رہے اور حکومت سب لوگوں کی بنیادی ضروریات کی کفیل ہو۔